کلاسیکی اردو غزل میں قنوطیت کے رجحانات

اسداللہ نیاز
پی ایچ ڈی سکالر (اردو) ایجوکیشن یونیورسٹی، لوئر مال، لاہور

CURRENTS OF PESSIMISM IN CLASSIC URDU GHAZAL

Asadullah Niaz
PhD Scholar (Urdu)
University of Education, Lower Mall, Lahore

Abstract

Pessimism stands opposite to Optimism. Pessimism is a tendency to see only the negative or worse aspects of everything whereas Optimism is to see positive and bright aspects of everything. These two terms categorize human beings' behavior and their outlook and worldview. Usage of these terms is abound in every worth mentioning literature of the world. Urdu literature is no exception. Urdu poetry and especially genera of ghazal is replete with trends of Pessimism. This article focuses pessimistic trends in classical Urdu ghazal.

Keywords:

افلاطون، ارسطو، ہیگل، ہنری برگساں، ولی دکنی، میر تقی میر، ذوق، مرزا غالب

لفظ 'قنوطیت' سے مراد ہے ''زندگی کا تاریک پہلو دیکھنا''(۱) اشتقاقی اعتبار سے لفظ ''قنوطیت'' عربی زبان کے لفظ ''قنط'' سے مشتق ہے۔عربی اردو لغت ''المنجد'' میں اس کے معانی ہیں ''ناامید و مایوس ہونا''(۲) ''قرآنی اردو (اشتقاقی انسائیکلوپیڈیا)'' میں اس لفظ کے معانی اس طرح درج کیے گئے ہیں:

''قنط: بھلائی سے مایوس ہونا، مایوس ہونا۔لاتقنطوا من رحمة الله(۳۹:۵۳)

اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ،قنوط(۴۱:۴۹) مایوس شخص، القنطین(۱۵:۵۵) جمع، مایوس لوگ۔اردو میں قنوطی اور قنوطیت مستعمل ہیں، شاعری کی اصطلاح میں قنوطیت (مایوسی کے مضامین)، رجائیت (پرامید مضامین) کی ضد ہے۔آیت(۳۹:۵۳) کے حوالے سے "لاتقنطوا" بھی اردو میں معروف ہے۔

جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا(اقبال)
تو ہے غلام مصطفٰے اچھے سمے کی آس رکھ
لاتقنطوا ہے حکم رب مصطفٰے تیرے لیے (افضال انور)(۳)

''قنوطیت'' کے لیے انگریزی زبان میں Pessimism کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی اس طرح درج کیے گیے ہیں:

"a feeling that bad things will happen and that something will not be successful"(۴)

انکارتا انگلش ڈکشنری میں لفظ "Pessimism" کے درج ذیل معانی بیان کیے گیے ہیں:

" Tendency to expect worst; a tendency to see only the negative or worse aspects of all things and to expect only the bad or upleasant things to happen" (۵)

یعنی برے حالات کی توقع رکھنے کا رجحان، چیزوں کا صرف منفی اور تاریک پہلو دیکھنا اور برے اور ناخوشگوار حالات کی توقع رکھنے کا رجحان۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں قنوطیت ایک انداز نظر کا نام ہے جس کے مطابق دنیا ایک بری جگہ ہے اور یہاں کی ہر چیز بری ہے۔ایک قنوطی شخص زندگی کے محض تاریک پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور اس دنیا سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھتا۔قنوطیت ایک ایسا رویہ ہے کہ جس کے تحت انسان مایوسی اور ناامیدی

کا شکار ہو جاتا ہے۔ زندگی کے روشن اور حسین پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور زندگی اس کے لیے تلخ و تاریک، ناخوشگوار اور خوفناک حقیقت بن جاتی ہے۔

قنوطیت ایک طرز احساس ہے جس کا عمیق مطالعہ علم فلسفہ اور علم نفسیات کا موضوع ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری آف فلاسفی کے مطابق 'Pessimism' (قنوطیت) کی اصطلاح سب سے پہلے کولرج نے استعمال کی اور قنوطیت کا بالکل واضح اور یقینی اظہار یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلیز (Sophoclese) کی طرف سے ہوا۔

> "The term 'Pessimism' is recorded as first used by Colridge in 1795. The best known and certainly the starkest expression of pessimism is from the Greek dramatist Sophoclese."(٦)

امام غزالیؒ نے یاس و قنوط کو ایک روحانی مرض قرار دیا ہے۔ امام غزالیؒ کے تصورات بیان کرتے ہوئے اظہر علی رضوی تحریری کرتے ہیں:

> ''امراض روحانیہ میں سے ایک مرض یاس یعنی ناامیدی بھی ہے۔ روح کے لیے یہ مرض سخت آفت ہے جو کہ روح کی اس صحت کو جو رحمت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے ختم کر دیتا ہے اور اس طرح اس کے قلب میں خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ صفات عظیم باقی نہیں رہتیں۔''(٧)

افلاطون اور ارسطو سے لے کر ہیگل، شوپنہار، نٹشے اور ہنری برگساں تک مختلف فلسفیوں نے انسانی زندگی، اس کے مقاصد، اس کے مسائل اور ان کے حل کے لیے مختلف نظریات پیش کیے۔ کسی نے یہ کہا کہ دنیا انسانی ذہن کے لیے ناسازگار ہے وہ دنیا میں بے بسی اور بے چارگی کا مارا ہوا وجود ہے تو کسی نے کہا دنیا ناقابل فہم ہے۔ کہیں شک پرستوں نے انسانی ذہنوں کو شکوک و شبہات سے دوچار کر دیا اور قنوطیت کا ماحول پیدا کر دیا۔

بعض مذاہب نے ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جس میں دنیا سے بے رغبتی کا درس دیا گیا اور دنیاوی جدوجہد میں شریک ہونے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ عیسائیت کی تعلیمات میں جہاں رجائیت کا پہلو موجود ہے وہاں رہبانیت کو بھی قرب الٰہی اور نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض مذاہب نے ترک خواہشات کا درس دیا ہے اور ترک خواہشات میں نجات کی راہیں دکھائی ہیں۔ بدھ مت کی تعلیمات میں قنوطیت کا عنصر

بڑا نمایاں ہے۔ بدھ مت کے مطابق انسانی خواہشات کو اگر ترک کر دیا جائے تو انسان دکھوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے بدھ کے نزدیک دنیا کی ہر چیز فانی ہے اور جو فانی ہے وہ دکھ دینے والا ہوتا ہے۔

اسلام میں مایوسی اور نا امیدی کو کفر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر انسانوں کو نا امید نہ ہونے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لاتقنطوا من رحمة الله(۸)

نفسیاتی اعتبار سے غم و الم، بے بسی، خوف، احساس ندامت، اضمحلال، تشویش اور شخصیت وہ عناصر ہیں جو کسی فرد میں قنوطی رویہ کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ احساس محرومی، نا آسودہ خواہشات، سماجی ناانصافی، ظلم و بربریت بھی ایسے عوامل ہیں جن کا سامنا کرنے میں معاشرے کے کسی فرد کو سخت مشکل اٹھانا پڑتی ہے اور یہ ایسے اجتماعی مسائل ہیں جن کا حل کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہوتی نتیجتاً ایسے معاشروں کے افراد میں بے چینی، اضطراب، بے حسی، خفگی، گھبراہٹ، مایوسی اور نا امیدی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مایوسی اور نا امیدی معاشرے کے ہر پہلو سے جھلکنے لگتی ہے۔

ادیب یا تخلیق کار چونکہ اسی معاشرے سے وابستہ ہوتا ہے اور معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہونے کی حیثیت سے ان نا مساعد حالات سے گہرا متاثر ہوتا ہے اور اس کی تخلیق اسی طرح کے احساسات کا مظہر ہوتی ہے جو عام طور پر پورے معاشرے کے اجتماعی احساسات ہوتے ہیں، ڈاکٹر اسلم انصاری کے بقول:

> ''جبر اور تشدد کے معاشرے میں ایک ادیب یا شاعر اپنے معاشرے کے ساتھ محبت کا اظہار دو طرح سے یا دو سطحوں پر کر سکتا ہے ایک معاشرے کے فرد کی حیثیت سے اور دوسرے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے، اگر چہ یہ دونوں حیثیتیں باہم مربوط ہیں اور ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر جبر و تشدد کے حامل معاشرے میں جبر و تشدد کے خلاف کوئی مزاحمتی عمل موجود ہے تو میرا خیال ہے کہ ایک Genuine ادیب اور شاعر قدرتی طور پر خود کو شریک محسوس کرے گا۔''(۹)

اردو غزل کی روایت میں درد و الم اور یاس و قنوط کے عناصر ابتدا ہی سے شامل رہے ہیں بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''فارسی شاعری کے تتبع نے اردو شاعری کو ابتداء میں ہی قنوطیت پسند بنا دیا۔''(۱۰)

غزل کی دکنی روایت اپنے عروج پر پہنچ کر ولی دکنی تک آتی ہے۔ ولی دکنی اگر چہ قنوطی شاعر نہیں

ہیں مگران کے ہاں بھی کہیں کہیں یاسیت کے مضامین مثلاً دردعشق،غم والم ،عاشق کی حالت زار، دنیا سے بے رغبتی، بے بسی اور دنیا کی بے ثباتی جیسے مضامین ملتے ہیں۔بے بسی، بیگانگی اور دنیا کی بے ثباتی کا اظہار بھی جا بہ جا ولی کی غزل میں ملتا ہے۔محبوب کی جدائی عاشق کو بے بس کر دیتی ہے اور اسے اپنے غم ہجر کا مداوا کہیں نہیں ملتا۔کوئی ایسا نہیں ملتا جس سے وہ اپنے دکھوں کی بات کرے۔لہٰذا اس دکھ کے سوا کوئی اس کا دوست نہیں۔

کہوں کس کن عزیزاں! جا کے درد بے نشان دل
نہیں یک گوش محرم تا سنے آہ و فغان دل
غبار خاطر غم ناک سوں مجھ پر ہوا ظاہر
کہ غیر از درد دوجا نہیں ہے یارِ کاروانِ دل

ولی زندگی میں مایوسی و ناامیدی اور ویرانی ورسوائی کا سبب غربت وافلاس کو سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک مفلسی ایک ایسی لعنت ہے جس کے سبب انسان دنیا میں ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے۔اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔بے کسی اور بے بسی اس کے دل کو پژمردہ اور ویران بنا دیتی ہے۔

باعث رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی

ولی کے ہم عصر شعرا نے بھی ولی کی تقلید میں غزل گوئی کے رجحان میں اضافہ کیا اور ولی کے رنگ کو اپنانے کی شعوری کوشش بھی کی۔ان شعرا میں اشرف گجراتی،سید محمد فراقی،فقیراللہ آزاد، پچھی نرائن شفیق، داؤد اورنگ آبادی،عزلت اور شاہ قاسم وغیرہ ہیں۔ولی کے بعد اس دور کے اہم غزل گو شاعر سراج اورنگ آبادی ہیں۔ان کی غزل میں ولی دکنی کی غزل کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ان کی غزل میں گہرا غم اور جذبہ واحساس بھی شامل ہو گیا ہے۔

میر، سودا اور درد کا عہد سیاسی انتشار اور تہذیبی زوال کا دور تھا۔میر تقی میر کا عہد مغلیہ سلطنت کے زوال اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد محمد شاہ کی سلطنت سے شروع ہوتا ہے۔یہ دور خانہ جنگی کا دور تھا۔حصول تخت کے لیے ملک کے اندر خانہ جنگی ہوئی اور مختلف بغاوتوں نے سر اٹھائے جس سے پورا ملک ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور مرہٹوں کی بغاوت، احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملوں نے دلی میں جو لوٹ مار، کشت وخون اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اس سے جہاں ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات خراب ہوئے وہاں بدامنی اور بدحالی کی وجہ سے دلی کی تہذیب بھی زوال پذیر ہوئی۔ان بدترین حالات

سے جہاں عام لوگ متاثر ہوئے وہاں اہل سخن نے بھی اس کے گہرے اثرات قبول کیے۔میر تقی میر کی شاعری میں بھی جا بہ جا اس تہذیب کی زوال پذیری کی نوحہ گری ملتی ہے۔

کوئی فرد مکمل طور پر قنوطیت پسند یا مکمل طور پر رجائیت پسند نہیں ہوسکتا بلکہ مختلف مواقع پر کسی شخص کا رویہ قنوطی بھی ہوسکتا ہے اور رجائی بھی۔اسی طرح ہم کسی شاعر کو مکمل طور پر قنوطی نہیں کہہ سکتے۔میر تقی میر کو اگر چہ مکمل طور پر قنوطیت کا شاعر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کی غزل میں قنوطیت کا ایک واضح رجحان ضرور ملتا ہے۔میر کی غزل میں ہم جا بہ جا یاس وقنوط کے مضامین دیکھ سکتے ہیں۔میر نے جس طرح غم والم کو اپنی غزل میں سمویا ہے یہ صرف انھی کا حصہ ہے۔دل شکستی اور نا کامی ومحرومی کے مضامین کو جس سلیقے سے انھوں نے پیش کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ڈاکٹر یوسف حسین خان اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''قدما میں میر تقی میر نے اپنے کلام میں درد والم اور نا کامی اور مایوسی کی جھلکیاں دکھائیں اور اس سلیقے سے دکھائیں کہ ان کی نظیر آج تک نہ پیدا ہوئی، میر کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر کی کوئی حد نہیں، وہ دل پر خون کے ایک جام سے عمر بھر مدہوش رہے، ان کی مدہوشی غم زیست کی مدہوشی ہے۔''(۱۱)

افسردگی، بے بسی، ویرانی، ناامیدی اور یاس وحرماں میر کی غزل کا ایک اہم رجحان ہیں۔ میر نے اپنی ذات کو سراپا حسرت و نا کامی کے طور پر بیان کیا ہے۔ان کے ہاں امید کے گل کبھی نہیں کھلتے انھوں نے اپنے دل کی زمین میں یاس وناامیدی کے بیج بوئے ہیں۔

ان کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلتی اور نہ ہی کبھی کوئی پھول ان کے دامن میں آ کے گرا ہے۔ان کی غزل کے اشعار میں سے ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

یہ بخت سبز دیکھو باغ زمانہ میں سے
پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک نہ پہنچا

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

سودا اگر چہ خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ غم والم کے گہرے تجربات سے نہیں گزرے لیکن ایک زوال پذیر معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ معاشرے کے کرب اور اضطراب

کے احساسات سے مکمل طور پر آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔سودا کو بنیادی طور پر 'بیروں میں' سمجھا جاتا ہے اور ان کے ہاں خارجیت، داخلیت پر غالب ہے لیکن پھر بھی ہم ان کی غزل کو احساسات وجذبات سے قطعاً پاک قرار نہیں دے سکتے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ تو ظاہر ہے کہ سودا کا دور، محسوس کرنے والوں کے لیے شدید جذباتی زلزلوں کا دور تھا ......اس میں غم، ایک اجتماعی جذباتی رویہ تھا۔عمومی مصائب و آلام نے ہر شخص کے لیے زندگی کے معنی بدل دیے تھے، فنا کا مضمون جو ہر شخص کے لیے ہر دور میں متاثر کرنے والا مضمون ہے، اس دور میں اس کی اصل حقیقت کچھ اور بھی واضح اس لیے ہوئی کہ فنا کی قدرتی صورتوں میں تقدیر کے ساتھ انسان کا اپنا ہاتھ بھی شریک تھا......اس لیے وہ لوگ بھی محسوس کرتے تھے جنہیں یوں خدا نے ہنسنے کھیلنے کا مزاج عطا کیا تھا مگر فنا اور غم کے تصورات نے ان کی باتوں میں بھی درد کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔غرض یہ کہ سودا اپنے زمانے کے سب اجتماعی جذبوں میں شریک نظر آتے ہیں اور اس کے سب سے زیادہ ثبوت ان کی غزل میں ملتے ہیں۔'' (۱۲)

سودا کی غزل میں کئی ایسے اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں جو افسردگی، غمِ ہجر، محرومی، گریہ وزاری، بے قراری، بے ثباتیِ عالم اور یاسیت کے مضامین لیے ہوئے ہیں:

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

بہہ گئے پانی ہو سب اعضا مری آنکھوں کی راہ
پیرہن میں ایک دم باقی ہے مانند حباب

مے خانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا
دھویا ہے نقش ساقی نے امید و بیم کا

درد نے جس طرح دل شکستگی، رنج والم اور یاس وحرماں کی تصویریں اپنے اشعار میں پیش کی ہیں وہ زیادہ تر عشقِ حقیقی کے زیرِ اثر ہیں اور یہ درد و کرب عشقِ حقیقی کے پُر خار راستوں کا ثمرہ ہیں اگر چہ عشقِ حقیقی میں قلبی کیفیات اور ان کی وسعت کا دائرہ کار عشقِ مجازی سے کمتر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود درد کی غزل میں کرب واضطراب، ہجر و وصال، دنیا کی بے ثباتی، زندگی اور غم کے رشتے اور مایوسی وناامیدی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔خواجہ میر درد کے نزدیک حیاتِ عالم کا ثمرہ دکھ درد ہے یہاں کا ہر فرد

غمزدہ ہے اور یہاں مصائب و آلام کے طوفان ہیں جس سے کوئی بچ نہیں سکتا اور صرف موت ہی ان دکھوں کا مداوا ہے اور اس دنیا کی زندگی میں صرف سوز اور کرب ہی انسان کا مقدر ہے۔ درد کے اشعار انھی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں:

کچھ گل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل
ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے شکستہ دل

زندگی ہے یا کوئی طوفاں ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس سے جی گھبرا گیا

دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا میں شیخ قلندر بخش جرأت، شیخ غلام ہمدانی، مصحفی، انشاء اللہ خان انشاء، شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ہیں۔

شیخ قلندر بخش جرأت کم عمری میں ہی اندھے ہو گئے تھے۔ جرأت کی غزل میں درد، سوز و گداز اور مایوسی و ناامیدی کے رجحانات پائے جاتے ہیں جو ان کے غمِ حیات اور احساسِ محرومی کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جرأت کی غزل میں غم والم، گریہ وزاری، دنیا کی اذیت ناکی، بے قراری واضطراب، بیزاری، بے ثباتی عالم اور ناامیدی و مایوسی کے مضامین موجود ہیں:

کل سے مایوس تھے ہم زیست سے پر اے یارو
آج، کل سے بھی کچھ احوال ہے بدتر اپنا

یاس کے اشعار سن جا اور بھی جرأت سے تو
فکر کا اس کے ہے جولانی سن اے صبا

مصحفی کی غزل میں اگرچہ میر تقی میر کی طرح غم کی گہرائی اور غم حیات کا کوئی منفرد تصور تو موجود نہیں ہے مگر ان کے ہاں ایک کسک اور درد کی ہلکی چبھن ضرور پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آہ و نالہ، دل بستگی، بے ثباتی عالم، گریہ وزاری، افسردگی اور یاس و ناامیدی کے مضامین جا بہ جا ملتے ہیں۔

پایا نہ اس چمن سے کسی نے لباس عیش
جو گل گیا سو خوں میں ڈوبا جامہ لے گیا

اب اس زیست سے مر ہی جانا ہے خوب
کوئی کھینچے کب تک اذیت بھلا

تخم امید اس میں جو بویا سو جل گیا
صحرائے دل کی حیف کہ بنجر زمین ہے

ناسخ کی غزل میں انسانی زندگی میں غم والم کی کثرت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ان کی غزل میں بے ثباتی عالم کے مضامین بھی موجود ہیں اور وہ بھی اس دنیا کی زندگی کو المیہ عناصر سے مرکب خیال کرتے ہیں اور درد والم اور یاس و ناامیدی کے مضامین ان کی غزل میں بھی بکثرت موجود ہیں:

رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گلچیں کا خطر، بلبل کو غم صیاد کا

آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے
مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا

آتش اگر چہ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں رجائیت غالب رجحان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی غزل میں زندگی کے گہرے غم والم اور زندگی کے مصائب و آلام کو بھی موضوع بنایا ہے۔ جہاں انھوں نے زندگی کے رجائی پہلوؤں کو بیان کیا ہے، وہاں تقدیر کے جبر اور انسان کی بے بسی کو بھی اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔ان کی غزل میں احساسات وجذبات کا بیان بھی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی غزل احساس اور جذبہ سے تہی ہے۔

آتش اس عالم فانی میں عرصۂ ہستی کو ایک برق وشرار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔اس کم وقتی میں انسان کی آرزوؤں کا پورا ہونا محال ہے۔ان کے خیال میں اس بے وقعت اور چار دن کی زندگی میں دنیا کو چھوڑ کر انسان کو آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔انھیں اس گنبد گردوں میں وحشت ہوتی ہے۔ان کا دل اس قدر افسردہ ہے کہ اس میں تمناؤں کی گرمی نہیں۔وہ چمن کی مٹی سے بھی سرد ہو گیا ہے۔ان کے چہرے پر مردنی سی چھائی رہتی ہے اور وہ اس دنیا سے بیزار ہیں۔ یہ تمام خیالات افسردگی، مایوسی، اضطراب اور یاسیت پر مبنی ہیں:

ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

باغ جہاں کو یاد کریں گے عدم میں کیا
کنج قفس سے تنگ رہے آشیاں میں ہم

ذوق، مومن، ظفر اور غالب کا عہد بدترین سیاسی انتشار کا دور تھا۔ یہ مغلوں کی حکومت کے زوال کا عہد تھا۔ ہر طرف افراتفری کا دور دورہ تھا اور ایک عدم تحفظ کی فضا پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ معاشی اور اقتصادی ابتری کے سبب اخلاقی و تہذیبی اقدار بھی زوال پذیر تھیں ان حالات میں اردو ادب پروان چڑھ رہا تھا۔ بقول ڈاکٹر صلاح الدین:

> ''نیچر کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان کی کارفرمائی کا عمل ہر طور جاری و ساری رہتا ہے، ایسا ہی اس دور میں ہو رہا تھا، جنگ کے میدانِ کارزار کی طاقت اور جوش کا اب میدانِ ادب کے کارزار میں ظہور ہو رہا تھا۔ قوتِ بازو قلم کی صورت میں نمودار ہو رہی تھی اور قوتِ تلوار کا مقام قوت گفتار نے حاصل کر لیا تھا۔ دنیائے سیاست برباد ہو کر دم توڑ چکی تھی اور دنیائے ادب آباد ہو کر پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی بہار دکھا رہی تھی۔''(۱۳)

ذوق اس دور کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ذوق کے ہاں گہرے رنج و الم اور یاس و حرماں کا احساس تو نہیں پایا جاتا تاہم ان کے ایسے احساسات کا وجود رسمی یا روایتی اور عمومی سطح پر ضرور ہے۔ ان کے ہاں کوئی غمگینی، افسردگی اور پژمردگی کا مسلسل احساس پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے لیے غم حیات بھی ایک عمومی سطح پر سامنے آتا ہے۔ زندگی کے عارضی پن اور بے ثباتی کو بھی ذوق نے اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے اور کئی جگہوں پر حیات انسانی کی حقیقت و اصلیت پر تفکر بھی کیا ہے:

ہے مقام زندگی زہر دم شمشیر مرگ
ہو گیا جس طرح کوئی دم، گزارا ہو گیا

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مومن خاں مومن کو اردو غزل میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ ایک رنگین مزاج، ذہین، خوددار اور خوش طبع انسان تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری عشق و محبت، معشوق کے حسن و جمال، ناز و ادا اور خیال آفرینی پر مشتمل تھی۔ لیکن مجموعی اعتبار سے ان کی شاعری صرف ظاہری کیفیات، عشق مجازی اور بوالہوسی ہی نہیں ان کے ہاں حقیقی جذبات نگاری کا سراغ بھی ملتا ہے۔ مومن کے ہاں عشق مجازی کی

داستان ہے لیکن ان کے عشقیہ جذبات رسمی نہیں بلکہ حقیقی تھے کیونکہ وہ بذاتِ خود عشق کے تجربے سے گزرے تھے۔مومن کی غزل میں مصنوعی جذبات کی بجائے داخلی کیفیات، حقیقی صداقت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

مسلسل غم واندوہ اور کرب واضطراب، ناکامیوں اور محرومیوں اور وحشت وافسردگی کا نتیجہ مایوسی وناامیدی ہوتا ہے۔عشق کی راہ میں آنے والے مصائب وآلام ناکامیوں اور غمِ جدائی نے مومن کے اشعار میں یاس وقنوط کا عنصر بھی پیدا کر دیا ہے۔نمونے کے طور پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

چشمِ نرگس بدنظر ہے اور گل بے اعتبار
بے وفا سیرِ گلستاں کیا کرے گا دیکھ کر

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

غالب اگرچہ ایک نشاط پسند شاعر تھے اور حیات انسانی کا رجائی پہلوان کے ہاں غالب رہا اور حسن وجمال اور نشاط وامید ان کی شاعری کے اہم رجحانات قرار پاتے ہیں لیکن ان کی شاعری زندگی کے حقائق کے بیان سے خالی بھی نہیں ہے۔زندگی کے مسائل اور مشکلات کا شعور اور تفکر بھی پوری شدت کے ساتھ ان کی غزل میں عیاں ہوتا ہے۔غالب کی شاعری میں غم والم کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم انصاری رقم طراز ہیں:

> ''غالب.....زندگی کے شاعر ہیں، زندگی کے حسن وجمال کے شاعر ہیں، اور سب سے بڑھ کر آرزوئے جمال کے شاعر ہیں۔وہ طبعاً نشاط پسند اور نشاط جو تھے، لیکن انقلابات زمانہ نے ان کی ہر آرزو کو تشنۂ تکمیل ہی رکھا۔اس لیے ان کی شاعری میں غم والم کے وہ تصورات پیدا ہوئے جن کو مربوط کر کے دیکھا جائے تو ایک فلسفۂ غم مرتب ہوتا ہے، جس کی کئی فکری جہتیں سامنے سامنے آتی ہیں۔بلکہ دیکھا جائے تو مرزا غالب کے ہاں پہلی بار غم والم کے بارے میں تفکر اور تجزیے کا رویہ ملتا ہے۔(۱۴)

غالب کی غزل میں زندگی سے شکوہ وشکایت اور بیزاری کے احساس کے علاوہ ناتوانی، بے بسی، محرومی اور ناامیدی جیسے عناصر بھی شامل ہیں، وہ زندگی کے مسلسل مصائب وآلام اور جد وجہد سے گھبرا بھی

جاتے ہیں ۔ان کی نظر میں زندگی کی خوشیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے مصیبتوں اور مشکلات میں گھرا رہتا ہے ۔ایک مصیبت سے ابھی چھٹکارا نہیں ملتا اور دوسری سر پہ کھڑی ہوتی ہے ۔انسان کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں اور وہ بہت سی حسرتیں ساتھ لیے اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔غالب کے ہاں ایسے مضامین کثرت سے ملتے ہیں ۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ، درخور محفل نہیں رہا

ظفر کی غزل میں محرومیوں اور درد والم نے افسردگی پیدا کر دی ہے۔شاعر کا دل ہمیشہ اس جہان میں غمزدہ رہا اس پر ہمیشہ افسردگی چھائی رہی اور کبھی سکھ اور چین نصیب نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی غزل میں محرومی اور غم کے احساس کے ساتھ بدنصیبی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے:

کھل کھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے
دل ہمارا خوش و خرم نہ ہوا پر نہ ہوا

جب تک دم ہے رہیں گے یوں ہی غم ساتھ کے ساتھ
دیکھنا جائیں گے غم اور یہ دم ساتھ کے ساتھ

اس چمن میں اے صبا جائے گا آخر ہاتھ جھاڑ
کب تلک غنچہ رہے گا مشتِ زر باندھے ہوئے

حسرت، اصغر، جگر اور فانی نے اپنے اپنے انفرادی انداز میں اردو غزل کو سجایا اور غزل کو وسعت بخشی۔

فانی بدایونی کو یاسیت کا شاعر کہا جاتا ہے۔ فانی بدایونی کی غزل پر ایک جبر، غم والم اور یاس وقنوط کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے ۔فانی کا مزاج شروع سے ہی شعروسخن کی طرف مائل تھا لیکن حالات کی ناموافقت کی وجہ سے فانی کی شاعری درد والم اور محرومی ویاس کا مرقع بن گئی تھی۔ان کی غم پرستی کا سبب ان کے ذاتی حالات تھے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''زندگی کے خارجی حالات فانی کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھے،ان کے دل میں ایک مبرم غم بیٹھا ہوا تھا۔باپ کی شدت پسند طبیعت،عسرت اور تنگ دستی، بیٹی اور بیوی کی موت نے انہیں غم پرست اور قنوطی بنا دیا۔''(۱۵)

ذاتی حالات کے علاوہ سماجی حالات بھی فانی کی شاعری پر اثر انداز ہوئے۔ فانی کی ذہنی نمو اس دور میں ہوئی جو ملک میں شدید بے اطمینانی کا دور تھا۔ذاتی زندگی اور زمانے کے حالات نے فانی کو شدید متاثر کیا اور فانی کی شاعری میں، درماندگی، افسردگی،محرومی اور نا امیدی جیسے عناصر کی نمود ہوئی۔

فانی کا فلسفہ حیات بھی بہت سے ان مفکرین کی طرح ہے جو زندگی کو غم والم سے عبارت خیال کرتے ہیں اور انسانی خواہشات کو غم کا موجب سمجھتے ہیں۔فانی کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ اگر خواہشات ختم کر دی جائیں تو ہی راحت مل سکتی ہے۔جب تک دل ہے اور اس میں خواہشات موجود ہیں غم سے نجات نہیں پائی جا سکتی۔کہتے ہیں:

فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

فانی بدایونی کو یاسیت کا امام کہا جاتا ہے۔ان کی شاعری محرومی، ناکامی، بے بسی، دنیا کی بے ثباتی اور مایوسی و ناامیدی جیسے مضامین سے بھرپور ہے۔ان کے دل کی ویرانی میں آرزوؤں اور امید کا کوئی شائبہ تک بھی نہیں۔وہ اس دنیا میں اپنے آپ کو غریب الوطن سمجھتے ہیں جس میں ان کی کوئی آرزو کبھی پوری ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔وہ اس زمانے کی دو رنگی سے رنجیدہ ہیں۔اس دنیا کے لوگوں کے دل اخلاص، پیار اور محبت سے خالی ہیں۔ان کی زندگی سے تاریکیاں کبھی نہیں گئیں۔زندگی کے مصائب و آلام سے ان کے مزاج میں تلخی آ گئی ہے۔ان کو کبھی اپنا مدعا نہیں ملا۔ان کے مقدر میں ہمیشہ محرومیاں ہیں:

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

اس دل مایوس کی ویرانہ سازی کچھ نہ پوچھ
اس نے جب اور جو چمن تاکا بیاباں ہو گیا

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) فیروزاللغات، لاہور، فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ، طبع اول ۲۰۰۵ء

(۲) المنجدعربی اردو، کراچی، دارالاشاعت اردو بازار، جولائی ۱۹۷۵ء

(۳) عاشق حسین، لیفٹیننٹ کرنل (ر)، مرتب، قرآنی اردو(اشتقاقی انسائیکلوپیڈیا)، جہلم، بک کارنر مین بازار، ۲۰۰۸ء

(۴) Oxford Advance learner`s dictionary, Oxford university press 2005.

(۵) Ancarta world English Dictionary, 1999.

(٦) The Oxford Dictionary of Philosophy, simon Blackburn, oxford University press, New york,1994.

(۷) رضوی، اظہرعلی، ڈاکٹر، پروفیسر، مدیراعلیٰ، مسلم نفسیات کے خدوخال، لاہور، اردوسائنس بورڈ۲۹۹۔اپر مال روڈ، ۱۹۹۷ء، ص۔۱۷۹

(۸) القرآن(۵۳:۳۹)

(۹) انصاری، اسلم، ڈاکٹر، تکلمات، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۸۔مزنگ روڈ، ۲۰۰۰ء ص ۵۲

(۱۰) سدید، انور، ڈاکٹر، اردوادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۲۰۰٦ء ص ۵٦

(۱۱) خاں، یوسف حسین، ڈاکٹر، اردوغزل، اعظم گڑھ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۹

(۱۲) عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۳

(۱۳) صلاح الدین، ڈاکٹر، ذوق کا رنگ تغزل (مضمون)، مشمولہ، اردوغزل، مرتبہ، ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۹

(۱۴) انصاری، اسلم، ڈاکٹر، اردوشاعری میں المیہ تصورات، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۸

(۱۵) سدید، انور، ڈاکٹر، اردوادب کی مختصر تاریخ، ص ۳۵۰